معین الدین عقیل *

نو آبادیاتی مسلم ہندوستان میں قدیم و جدید علوم کی آویزش: پس منظر اور پیش منظر

جنوبی ایشیا کی معاشرتی و علمی تاریخ میں تعلیم کے فروغ کے لحاظ سے مسلمانوں کا عہد مثالی رہا ہے، بالخصوص عہد مغلیہ میں علم و تعلیم کی اشاعت اس قدر وسیع پیمانے پر ہو چکی تھی کہ مغلیہ حکومت کے طویل عہد زوال میں سیاسی انحطاط کے باوجود تعلیمی درس گاہیں اور مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت نہ صرف بدستور قائم رہا بلکہ اس میں کہیں کہیں مزید ترقی ہوئی۔ مولانا عبدالرحیم (۱۶۴۴ء – ۱۷۱۹ء)، مولانا عبدالعلی بحرالعلوم (۱۷۳۶ء – ۱۸۱۹ء)، شاہ ولی اللہ (۱۷۰۳ء – ۱۷۶۱ء) اور ان کے فرزند شاہ عبدالعزیز (۱۷۴۶ء – ۱۸۲۴ء) اور شاہ غلام علی دہلوی (۱۷۷۳ء – ۱۸۲۴ء) مسلمانوں کے اسی دورِ انحطاط میں اشاعت تعلیم اور اپنے درس و تدریس کی وجہ سے خاص شہرت و امتیاز رکھتے تھے۔ سیاسی طور پر تو مرکز برابر کمزور ہوتا رہا، لیکن جو نئی مسلمان سلطنتیں اور ریاستیں وجود میں آئیں، ان کے اکثر حکمرانوں نے علم کی سرپرستی کی۔ بعض علما نے بھی انتہائی ایثار سے اپنی زندگیاں درس و تدریس کے لیے وقف کر دیں۔ یہی وجہ ہے کہ سیاسی انحطاط کے باوجود علمی انحطاط کی رفتار نسبتاً کم رہی[1] اور بعض مسلم ریاستوں، مثلاً اودھ، روہیل کھنڈ اور حیدر آباد میں تعلیمی معیار برقرار رہا۔ چند نئے تعلیمی مراکز، مثلاً بلگرام، الہ آباد اور سہالی بھی وجود میں آئے اور دہلی کی حکومت ختم ہونے کے باوجود خود دہلی اور اس کے

معین الدین عقیل *

اضلاع میں تعلیمی ترقی کی روایت برقرار رہی۔[۲] معاشی زبوں حالی کے باوجود اس دور میں ایسے علما و مدرس بکثرت موجود تھے، جو عمر بھر طلبہ کو درس دینے کے ساتھ ساتھ اپنی قلیل آمدنی سے جو کچھ پس انداز کرتے ،اسے کسی مدرسے کی تعمیر میں ہی صرف کر دیتے۔[۳] یہ علما ہی تھے کہ سیاسی زوال کے عرصے میں حکومت اور امرا کی سرپرستی اور مالی امداد سے قطع نظر ملک کے روایتی تعلیمی نظام کو قائم رکھنے اور وسعت دینے میں مشغول رہے۔

انگریزوں کی آمد کے وقت مسلمانوں میں تعلیم کا اپنا ایک خاصا جمہوری اور روایتی نظام روبہ عمل تھا، جس میں تعلیم اور مذہب کے درمیان رابطہ استوار رکھا گیا تھا اور عربی زبان اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ تھی۔ ہر سطح کی تعلیم، ایک ایسا سرمایہ تھی، جسے ہر کوئی بلا روک ٹوک حاصل کرسکتا تھا۔ نہ اس پر کوئی شرط اور پابندی عائد ہوتی اور نہ اسے کسی طرح کا معاوضہ ادا کرنا ہوتا۔ سیاسی صورت حال کے بدل جانے کے باوجود تعلیم کا یہ نظام اس وقت تک برقرار رہا، جب تک کہ انگریزوں نے سیاسی اقتدار پر قبضہ جمانے کے بعد تعلیمی نظام میں تبدیلی کی صورت نہ پیدا کر دی۔ انگریزوں کی آمد اور سیاسی اقتدار پر قابض ہونے کے کچھ عرصے بعد تک بھی یہ صورت حال کم وبیش اسی طرح برقرار رہی کہ محض بنگال میں، جہاں انگریزوں نے سب سے پہلے قدم جمائے، اسّی ہزار مدرسے تھے اور وہاں چار سو کی آبادی کے لیے ایک مدرسے کا اوسط ہوتا تھا[۴] اور قصبات کے بچے بالعموم لکھ پڑھ سکتے تھے[۵] اور اس وقت تک جب تک کہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے دیہی اداروں کو توڑ نہ دیا، دیہاتوں میں قدیم تعلیمی ادارے بدستور برقرار رہے، لیکن سرپرستی سے بتدریج محروم ہوتے چلے گئے۔

اس صورت حال کا اثر یہ ہوا کہ ان درس گاہوں کے اساتذہ، جو علما کی مثال تھے، اپنے معاشرے سے دور ہوتے چلے گئے۔ اس طرح یہ انگریزی تعلیم کا بڑھتا ہوا سیلاب ہی تھا کہ جس نے معاشرے میں انھیں ہر طرح متاثر کیا۔ چنانچہ ان نئے حالات اور اثرات میں انھوں نے ملی جذبے کے تحت اپنی زندگیاں اس مذہبی تعلیم کے لیے وقف کر دیں، جس پر اب خود ان کی اور ان کی قوم کی زندگی اور ان کے دین و ایمان کا دار و مدار رہ گیا تھا۔ لہٰذا بڑی مستقل مزاجی، مستعدی اور خلوص و بے لوثی کے ساتھ وہ اپنی تعلیم و تدریس کی روایات برقرار رکھنے میں کامیاب ہوئے اور ملک اور معاشرے میں ہر

طرح کے زوال کے باوجود علم اور تعلیم ان کی زندگی کا لائحہ عمل بنے رہے۔ لکھنؤ کا مدرسہ 'فرنگی محل'، اور دہلی کا 'مدرسہ رحیمیہ' مسلمانوں کے عہد زوال کی سب سے بڑی علمی یادگاریں ہیں۔ 'مدرسہ رحیمیہ' کے فیض سے شاہ ولی اللہ اور ان کے فرزندوں کی تحریک نے آئندہ ڈیڑھ سو برسوں تک برعظیم کے مسلمانوں پر اپنا راست اثر قائم رکھا، جس سے بیسویں صدی کے وسط تک پیدا ہونے والی تمام اسلامی تحریکیں متاثر ہوئیں۔ 'فرنگی محل' نے علوم اسلامی کے فروغ اور اس کی روایات کو آگے بڑھانے میں قابل قدر حصہ لیا، اور اس سے منسلک اور مستفیض علما نے برعظیم کی قومی اور سیاسی تحریکوں کے دوران مسلمانوں کی رہبری اور قیادت کی۔ شاید ہی کوئی قابل ذکر عالم اس عرصہ میں ایسا ہو، جس کا سلسلہ علماے فرنگی محل کے فرزندوں یا شاگردوں میں سے کسی تک نہ پہنچتا ہو۔[۶] اس کی علمی حیثیت کا طفیل تھا کہ اس کے طلبہ اسلامی شرعی نظام کے تحت قاضی، مفتی اور محتسب بن سکے اور شرعی عدالتوں سے منسلک ہو سکے۔ اس نصاب کو برعظیم کے تقریباً سب ہی مدارس نے اختیار کیا۔ اس طرح 'فرنگی محل' نے اپنی علمی اور تعلیمی تحریک سے برعظیم میں مسلمانوں کے قدیم طریقۂ تعلیم میں اپنے اثرات مرتسم کیے اور یہ اثرات تا حال نظر آتے ہیں۔[۷] یہ مدرسہ، عرف عام میں اس طرح کا مدرسہ نہیں تھا، جیسا کہ بعد میں 'دارالعلوم دیوبند' اور 'ندوۃ العلماء' قائم ہوئے، اسے مدرسۂ فکر کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ ہاں، مولانا عبدالباری ندوی (۱۸۷۸ء – ۱۹۲۶ء) نے اسے ۱۹۰۸ء میں لکھنؤ میں 'مدرسۂ نظامیہ' کی صورت دی، جو فرنگی محل کی عمارات میں ان کے انتقال کے بعد بھی جاری رہا۔[۸] فرنگی محل کے علما میں سے چند بااثر علما، مثلاً مولانا عبدالحئی (۱۸۴۸ء – ۱۸۸۶ء) نے مسلمانوں کو انگریزی تعلیم کی اجازت دے دی تھی، بشرطیکہ اس سے مذہب کو کوئی خطرہ لاحق نہ ہو،[۹] لیکن اس کے باوجود مدرسہ فرنگی محل اور اس سے وابستہ علما کی برطانوی عہد میں ایک اہمیت یہ ہے کہ انھوں نے برعظیم میں اسلامی تعلیم کی تشکیل نو کی کوشش کی اور اپنے حلقۂ اثر کے مسلمانوں کو روایتی تعلیم سے قریب تر رکھا، علما کے لیے ایک بلند تر معیار کا تعین کیا، ہر چہار جانب سے آنے والے طلبہ کی تربیت کی اور سارے برعظیم میں طلبہ کی لیاقت کا معیار یہ ٹھہرایا کہ وہ 'درس نظامی' کی تکمیل کر لیں۔ علماے فرنگی محل کو ان کی شخصیت کے غیر متنازعہ پہلو اور ان کی پرخلوص علمی کاوشوں کی وجہ سے ہمیشہ احترام حاصل رہا ہے۔[۱۰]

علماے فرنگی محل کے معاصر علما میں 'مدرسہ رحیمیہ' سے فیض یافتہ اور شاہ ولی اللہ اور ان کے خاندان کے علما کا ایک طویل سلسلہ ہے، اور ان کے ساتھ ساتھ دہلی میں علماے خیر آباد[11] اور مجددیہ[12] سلسلے کے علما کا ایک وسیع حلقہ ہے، جو اسلامی علوم کی درس و تدریس اور ترقی میں مصروف رہے۔ شاہ ولی اللہ کی تحریک سے مستفیض علما نے جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء میں بڑی جانفشانی سے حصہ لیا،[13] لیکن اس میں ناکامی ان مجاہد علما کے جذبات کو کم نہ کرسکی۔ خصوصاً سید احمد بریلوی کی تحریکِ جہاد سے تعلق رکھنے والے باقی ماندہ علما نے جنگِ آزادی میں بساط بھر حصہ لینے کے بعد اپنی جہادی سرگرمیوں کا مرکز شمال مغربی سرحدی علاقوں کو بنایا، لیکن ان کے ہم مسلک علما کے ایک طبقے نے شاہ عبدالعزیز کے مدرسۂ دہلی کے انداز پر، جو جنگ آزادی کے دوران بند ہوگیا تھا، مولانا محمد قاسم نانوتوی (۱۸۳۲ء–۱۸۸۰ء) کی سربراہی میں ۱۸۶۷ء میں دیوبند میں ایک مدرسہ قائم کیا اور اسے اپنے مذہبی اور سیاسی خیالات کی تعلیم و تلقین کا ذریعہ بنایا۔[14] اس کے قیام سے برعظیم کے مسلمانوں کی مذہبی قیادت کا مرکز دہلی سے دیوبند منتقل ہوگیا؛ جس نے کچھ عرصے بعد برعظیم کے مسلمانوں کی تعلیم اور سیاست میں نئی جہات کا تعین کیا۔

مدرسۂ دیوبند کے قیام کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ شاہ ولی اللہ کی تحریک سے وابستہ علما کی صحبت اور فیض رسانی اور مدرسے کی باقاعدہ تعلیم سے جس قدر علما تیار ہوں، وہ مساجد اور مدارس میں کام کرنے کی پوری استعداد رکھتے ہوں، درسی کتابوں سے فارغ ہوکر اساتذہ کی صحبت میں رہیں اور ان سے شاہ ولی اللہ کی حکمت اور سیاسی اصول سیکھیں۔[15] ابتدا بہت معمولی تھی۔ مولانا قاسم آغاز سے اس کے سرپرست اور مہتمم رہے۔ اس کا نصابِ تعلیم، مستقل نظامِ عمل اور اسلامی قواعد انھی نے ترتیب دیے، جن میں بعد میں ترامیم ہوتی رہیں۔[16] مولانا رشید احمد گنگوہی (۱۸۲۸ء– ۱۹۰۵ء)، مولانا محمد یعقوب نانوتوی (۱۸۳۳ء – ۱۸۸۴ء) جیسے نامور اور دیگر کئی علما اس میں درس دیتے تھے۔ مولانا قاسم کے انتقال کے بعد مولانا گنگوہی اس کے سرپرست بنے، جن کے انتقال پر اس مدرسے کی تاریخ کا پہلا دور ختم ہوتا ہے۔ اس دور میں اس کا نمایاں کارنامہ علمی تحریک کی توسیع اور بنیادی و مرکزی فکر کی حفاظت تھا۔ اس عرصے میں دیوبند کی علمی تحریک اطرافِ ہند سے نکل کر افغانستان، ترکی، وسط ایشیا اور حجاز تک پہنچ گئی۔[17] اس کی علمی شان اس حد تک تھی کہ یہاں سے فارغ التحصیل طلبہ کی ایک اچھی خاصی تعداد

مقتدر اور متبحر علما کی حیثیت سے نمایاں ہوئی اور اس نے برعظیم کی علمی اور قومی و سیاسی تحریک کو قوت اور توانائی عطا کی۔

دیوبند کا مدرسہ، علی گڑھ میں سید احمد خاں (۱۸۱۷ء – ۱۸۹۸ء) کے قائم کردہ 'محمڈن اینگلو اورینٹل کالج' سے، جو سید احمد خاں کی ہمہ گیر تعلیمی تحریک کا ایک اہم اقدام تھا، چند سال قبل، ۱۸۶۷ء میں، قائم ہوا تھا۔ یہ دونوں ادارے، جن کے درمیان کچھ عرصے بعد اولاً کشیدگی لیکن پھر مخصوص باہمی روابط کی صورتیں پیدا ہوئیں، دراصل ایک ہی مسلک روحانی کے تحت قائم ہوئے تھے، جس کا سلسلہ شاہ ولی اللہ تک پہنچتا ہے،[18] لیکن دیوبند سے قطع نظر، کہ جس نے نصاب اور نظام تعلیم میں روایت اور مراجعت کو مدنظر رکھا،[19] سید احمد خاں نے قدیم اور جدید علوم کا ایک متوازن نصاب علی گڑھ کالج کے لیے تجویز کیا تھا۔ ویسے مولانا قاسم بھی مدرسے کے نصاب میں قدیم علوم کے ساتھ ساتھ جدید علوم کے حق میں تھے[20] اور اس مقصد سے کہ دیوبند کے فارغ التحصیل طلبہ دوسرے اداروں میں جا کر انگریزی اور جدید علوم حاصل کرنا چاہیں تو جا سکیں، دس سالہ نصاب کو کم کر کے چھے سالہ کر دیا گیا، تاکہ طالب علم کم عمری ہی میں دوسرے ادارے میں داخل ہو سکے۔[21] ۱۹۰۵ء میں مولانا محمود حسن (۱۸۵۱ء – ۱۹۲۰ء) کی سرپرستی سے مدرسۂ دیوبند کا دوسرا اور مدرسے کے علما اور طلبہ کی عملی سیاست میں شرکت کا پہلا دور شروع ہوتا ہے۔ یہ اپنے ہم عصر علما کے مقابلے میں، انقلابی اور ترقی پسندانہ خیالات رکھتے تھے۔ انقلابی جماعتوں کے مسلمانوں، ہندوؤں اور سکھوں سے ان کے قریبی روابط تھے۔[22] ان کے عہد میں دیوبند کے انقلابی خیالات رکھنے والے طلبہ کو بڑی تقویت حاصل ہوئی۔ ان طلبہ میں عبید اللہ سندھی (۱۸۷۲ء – ۱۹۴۴ء) زیادہ نمایاں تھے، جنھوں نے ۱۹۰۹ء میں سابق طلبہ کی ایک انجمن 'جمعیۃ الانصار' بنائی تاکہ خلافِ حکومت اور اتحاد اسلامی کی سرگرمیوں میں دیوبند کے طلبہ کو شریک کر سکیں۔[23] اس کے توسط سے دیوبند اور علی گڑھ کے درمیان آل انڈیا نیشنل کانگریس میں شرکت کے مسئلے پر جو دیرینہ کشیدگی پائی جاتی تھی، وہ دور ہو گئی۔[24] مولانا محمود حسن نے، جو ایک ہمہ گیر سیاسی تحریک چلانا چاہتے تھے، دراصل علی گڑھ کے انقلابی عنصر کو بھی اپنے ساتھ شامل کرنے کی کوشش کی تھی۔[25] علی گڑھ اور دیوبند میں یوں بھی کبھی یکسر مغائرت نہ تھی۔ سید احمد خاں کے علاوہ، کہ جو دیوبند اور اس کے مقصد کو سراہتے تھے،[26]

نواب وقار الملک (۱۸۴۷ء – ۱۹۱۷ء) نے دیوبند کے لیے حکومت حیدر آباد سے مالی امداد کا انتظام کرایا، اور ایک موقع پر دیوبند کے طلبہ نے ان کی خدمت میں سپاس نامہ پیش کیا۔[۲۷] اس کے جلسوں میں علی گڑھ تحریک کے ایک فعال رکن صاحب زادہ آفتاب احمد خاں (۱۸۶۷ء – ۱۹۳۰ء) بھی شریک ہوتے تھے۔ اس وقت دیوبند کی علی گڑھ کالج سے یہ مفاہمت ہوئی تھی کہ دیوبند کے مذہبی تعلیم یافتہ اگر انگریزی تعلیم حاصل کرنا چاہیں تو علی گڑھ میں حاصل کریں اور علی گڑھ کے انگریزی خواندہ وہ طلبہ جو مذہبی تعلیم حاصل کرنا چاہیں تو دیوبند سے رجوع کریں۔[۲۸] یہ صورت دراصل اس بات کی علامت تھی کہ دونوں مکاتیب فکر کے نقطۂ نظر بنیادی طور پر وقتی ضرورتوں کے تحت ایک درمیانی راہ کی تلاش میں تھے۔

سید احمد خاں نے بھی بنیادی طور پر دراصل یہی کوشش کی تھی کہ مسلمان عصری تقاضوں کے تحت مغربی تعلیم حاصل کریں اور انگریزی زبان سیکھیں۔ وہ انھیں مسلمانوں کے تمام امراض کا شافی علاج سمجھتے تھے، لیکن اس کے باوجود مذہبی علوم اور عربی و فارسی سے انھوں نے کبھی بے اعتنائی نہیں برتی۔ اپنے تعلیمی منصوبوں کی مخالفت کے نتیجے میں انھوں نے 'مدرسۃ الاسلام' کے لیے، جو بعد میں 'محمڈن اینگلو اورینٹل کالج' بن گیا، ۱۸۷۴ء میں مذہبی علوم کے نصاب کی تیاری کے لیے ایک مجلس تشکیل دی، جس میں اس وقت کے جید علما شامل تھے، لیکن علما کے رویے کی وجہ سے انھیں اس میں کامیابی نہیں ہوئی۔ بعض علما نے انکار کر دیا کہ وہ کسی ایسی مجلس میں کام نہیں کر سکتے، جس میں شیعہ بھی موجود ہوں۔[۲۹]

سید احمد خاں کا عقیدہ تھا کہ کوئی بیرونی طاقت مسلمانوں کی تعلیم کی سرپرستی نہیں کر سکتی اور کسی قوم کے لیے اس سے زیادہ ذلت کی بات اور کیا ہوسکتی ہے کہ وہ اپنی قومی تاریخ کو بھول جائے اور اپنے اسلاف کے کارناموں کو نظر انداز کر دے۔[۳۰] انھوں نے 'اینگلو – اورینٹل' کالج قائم کیا تھا، جس میں مشرقی اور مغربی علوم کے علاحدہ علاحدہ شعبے تھے۔ مشرقی علوم کے شعبے میں اردو میں علوم شرقیہ، فارسی و عربی ادب اور جدید علوم پڑھائے جاتے تھے۔ اس میں انگریزی بھی بطور زبان پڑھائی جاتی تھی۔ مغربی علوم کے شعبے میں یونی ورسٹی کا مقررہ نصاب پڑھایا جاتا تھا۔[۳۱] کچھ عرصے تک یہ

دونوں شعبے جاری رہے، لیکن علوم شرقیہ کا شعبہ زوال پذیر رہا۔ یہاں تک کہ اساتذہ کی تعداد طلبہ کی تعداد سے زیادہ ہوگئی، چنانچہ مجبوراً اسے بند کر دیا گیا۔[۳۲]

'محمڈن اینگلو اورینٹل کالج' کا قیام سید احمد خاں کے تعلیمی لائحہ عمل کا ایک اہم جز تھا، مگر ان کے اصل خواب کی یہ ایک جزوی تعبیر تھی اور وہ یہ دیکھ رہے تھے کہ یہ کالج مسلمانوں کی تعلیم کا سارا مسئلہ حل نہیں کر سکتا۔ ایک ایسے ادارے کی ضرورت مزید تھی، جو مسلمانوں کی تعلیم کے مسائل کا حل تلاش کرے اور تعلیم کو وسعت دے سکے۔ اس لیے انھوں نے ۱۸۸۶ء میں 'محمڈن اینگلو اورینٹل ایجوکیشنل کانفرنس' کی تنظیم کی، جس کا مقصد مسلمانوں میں جدید تعلیم کو مقبول بنانے کے ساتھ ساتھ قدیم تعلیم میں عصری ضروریات کے ساتھ مطابقت پیدا کرنا تھا۔[۳۳] اس کے علاوہ اسلامی علوم کی حوصلہ افزائی، مکتب اور مدارس کے قیام کے ذریعے قدیم نظام تعلیم اور قدیم علوم کا تحفظ اور تاریخی تحقیق اس کے ضمنی مقاصد تھے۔[۳۴] اس کانفرنس کو ایک مستقل جماعت کی حیثیت حاصل ہوگئی اور اس نے تعلیم کے متعلق مسلمانوں میں ایک نیا شعور پیدا کرنے کے علاوہ مسلمانوں کی تعلیم کے بڑھتے اور زمانے کے بدلتے ہوئے مسائل پر تبادلۂ خیالات کا ایک ادارہ مہیا کرنے کا مفید مقصد بھی پورا کیا۔ جب قوم میں علی گڑھ کالج کے قیام کے مفید اثرات صاف طور پر نظر آنے لگے تو اس کانفرنس کو اپنے مقاصد میں مزید کامیابیاں حاصل ہونے لگیں اور اس کے اثرات مسلمانوں میں اس طرح پھیلنے لگے کہ اپنی قوم کے لیے 'محمڈن کالج' کے نمونے پر محمڈن اسکولوں اور محمڈن کالجوں، اور کچھ ہی عرصے کے بعد میں اسلامیہ اسکولوں اور اسلامیہ کالجوں کا قیام قومی خدمت کا سب سے زیادہ مقبول طریقہ بن گیا۔

اس صورت حال میں قدیم اور جدید نظام تعلیم کے فرق کو پیش نظر رکھتے ہوئے اور تیزی سے بدلتے ہوئے زمانے کی ضرورتوں کے ساتھ ساتھ مغربی علوم کی دعوت مقابلہ کے نتیجے میں شبلی نعمانی (۱۸۵۷ء – ۱۹۱۴ء) اور بعض علما کے ذہن ایک ایسے ادارے کے قیام کی بابت سوچ رہے تھے، جہاں ضرورت زمانہ کے مطابق قدیم اور جدید نصاب کی تدریس ہو سکے اور اس کے ذریعے علما کو ان کی وہ حیثیت، جو برطانوی عہد میں مذہب اور سیاست کے الگ ہونے سے معدوم ہو گئی تھی، یاد دلا کر معاشرے کی تعمیر کی جانب بلایا جا سکے۔[۳۵] شبلی اس کے بہت مستعد داعی تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ جو

نصاب اسلامی درس گاہوں میں مروج ہے اس نے ایک وقت میں بڑے بڑے علما پیدا کیے، جن میں عبدالعلی بحر العلوم (۱۷۳۷ء – ۱۸۲۰ء)، محبّ اللہ بہاری (متوفی ۱۷۷۶ء)، قاضی مبارک (متوفی۱۷۴۹ء)، شاہ ولی اللہ جیسے اکابر شامل تھے، لیکن ان کے شاگردان سے کم درجے کے نکلے، شاگرد کے شاگردان سے بھی کم، پھر ان سے بھی کم کہ اب اہلِ کمال کا نام ونشان بھی نہیں۔ اس لیے شبلی اس حق میں تھے کہ نصاب کو آج کی ضرورتوں کے مطابق ڈھالنے کی ضرورت ہے جس میں قدیم علوم کے ساتھ ساتھ جدید علوم اور انگریزی زبان بھی شامل ہونی چاہیے۔[۳۶] اس وقت ان کے ہم خیال علما میں مفتی لطف اللہ علی گڑھی (۱۸۲۸ء – ۱۹۱۶ء)، مولانا عبدالحق حقانی (۱۸۵۰ء – ۱۹۱۶ء)، شاہ محمد حسین الہ آبادی (۱۸۵۳ء – ۱۹۰۴ء)، اور غلام حسین کنتوری (۱۸۲۷ء – ۱۹۱۵ء) بھی تھے۔ چنانچہ ۱۸۹۴ء میں مفتی لطف اللہ کے مدرسۂ فیضِ عام، کانپور میں ایک تقریب میں ایک مجلس ندوۃ العلماء کا قیام عمل میں آیا۔ مسلمانوں کی تعلیم کے باب میں یہ اجتماعی کوشش کی پہلی مثال ہے۔ جن علما نے اس نئی مجلس کی ضرورت والی دستاویز پر دستخط کیے، ان میں اس وقت کے اکابر و مشاہیر شامل تھے۔[۳۷] ان میں دیوبند سے منسلک علما بھی تھے، علی گڑھ تحریک سے وابستہ علما بھی اور شاہ ولی اللہ کی فکر اور تحریک سے بالواسطہ یا بلا واسطہ متاثر علما بھی۔ اس طرح دیوبند، ندوہ اور علی گڑھ ایک ہی مذہبی فکر کے سوتے نظر آتے ہیں۔

یہ وہ علما تھے، جنھوں نے علی گڑھ اور دیوبند دونوں سے قطع نظر، ایک وسطی نقطۂ نظر کی طرف رجوع کیا تھا۔ ایک قدامت میں کچھ جدید عنصر شامل کرنا چاہتا تھا اور دوسرا جدید کو قدامت کا پابند رکھنے کا خواہاں تھا۔ زیادہ اہم بات یہ ہے کہ علما کے اس طبقے نے علما کو اجتماعی زندگی میں قیادت سنبھالنے کی دعوت دی۔[۳۸] شبلی اور مولانا عبدالحق حقانی نے اس کے قواعد وضوابط مرتب کیے۔ اس کا مقصد عربی مدارس کا فروغ، اشاعتِ اسلام، مختلف الخیال علما کا رفعِ نزاعِ باہمی، سماجی اصلاح اور قوم کا مجموعی مفاد قرار دیا گیا،[۳۹] نصاب کو روشن خیال بنیادوں پر استوار کیا گیا[۴۰] اور مضامین میں انگریزی اور جغرافیہ بھی شامل کیے گئے،[۴۱] لیکن ۱۹۱۳ء میں اس کے نصاب میں تبدیلی واقع ہوئی اور اسے درسِ نظامیہ کے قریب کر دیا گیا۔[۴۲] اس کی منصوبہ بندی اس طور پر کی گئی تھی کہ یہ تمام اسلامی مدرسوں،

بشمول علی گڑھ کالج کا خود سے الحاق کر سکے۔[۴۳] انگریزی کو اس مصلحت کے تحت نصاب میں رکھا گیا کہ اس کے ذریعہ فلسفۂ مغرب کا رد کیا جا سکے[۴۴] اور آریاؤں سے مناظرے کرنے کے لیے ہندی اور سنسکرت زبانیں نصاب میں شامل کی گئیں۔ طلبہ کے لیے فوجی تربیت اور سیاسی و تاریخی موضوعات پر تقریر کی مشق کا اہتمام بھی کیا گیا۔[۴۵]

ندوہ کے قیام کا علی گڑھ تحریک کے اکابر، بالخصوص سید احمد خاں، نواب محسن الملک (۱۸۳۷ء – ۱۹۰۷ء) اور نواب وقار الملک نے خیر مقدم کیا۔[۴۶] شبلی ندوہ اور علی گڑھ کے درمیان رابطے کی ایک کڑی تھے۔ انھوں نے ندوہ کے قیام اور اس کے لیے نصاب تیار کرنے کے علاوہ بعض عمدہ علمی روایات قائم کیں اور زیادہ اہم کام قلم سے کیا۔ وہ ندوہ کے توسط سے اشاعتِ اسلام کی تحریک چلانا چاہتے تھے۔ اس کے لیے انھوں نے منصوبے بنائے اور انھیں پھیلایا۔[۴۷] ڈھاکا کے نواب سلیم اللہ خاں (۱۸۸۴ء – ۱۹۱۵ء) کو اس تنظیم کا صدر مقرر کیا، جس کے ذریعے وہ اشاعتِ اسلام کا کام کرنا چاہتے تھے اور اس کا مرکز ندوہ کو قرار دیا،[۴۸] لیکن وہ یہ کام مکمل نہ کر سکے، زندگی نے انھیں مہلت نہ دی۔

علی گڑھ سے وابستگی کے باوجود شبلی نے اس کی روح کو کبھی پوری طرح اپنی شخصیت میں جذب نہیں کیا تھا چنانچہ ان کے شاگردوں میں علی گڑھ تحریک سے فاصلہ برقرار رہا۔ اس کے باوجود ندوہ میں علی گڑھ کے اثرات تلاش کیے جا سکتے ہیں۔ شبلی نے قیام علی گڑھ میں مغربی درس و تدریس اور جدید علم کلام کے اصولوں اور مستشرقین کی کتابوں سے جو استفادہ کیا تھا اس کا فیض ان کے ذریعے ان کے مخصوص تلامذہ اور ندوہ کے عام طلبہ تک پہنچا۔ علی گڑھ کے علاوہ علماے مصر کے اثرات بھی ندوہ میں جھلکتے ہیں۔[۴۹] ندوہ نے ان دونوں سرچشموں سے فیض حاصل کر کے ایسے علما پیدا کیے، جن کی نظر رفتارِ زمانہ پر رہی اور جو ایک خاص اسلوب کے تحت قوم کی علمی ضرورتوں کو پورا کرنا چاہتے تھے۔ شبلی کی عالمانہ لیاقت سے ندوہ نے، جب تک شبلی اس سے منسلک رہے، خاطر خواہ فائدہ اٹھایا۔ شبلی کی زیادہ توجہ اصلاح نصاب پر تھی۔ قدیم فلسفہ و منطق کو اس کے نصاب سے انھوں نے اس لیے خارج کیا کہ یہ یونانی علوم اسلامی علوم نہیں تھے۔[۵۰] ان کے بجائے وہ جدید علوم اور انگریزی کو نصاب میں اس لیے شامل کرنے کے حق میں تھے کہ ان کے خیال میں یہ اب خود اسلامی علوم پر دسترس کے لیے ناگزیر

ہوگئے تھے۔[۵۱] اس سے بڑھ کر ان کا مقصد ندوہ جیسے ادارے کے قیام سے یہ تھا کہ وہ ایک نیا علمِ کلام پیدا کرے اور علما کو نئے علوم وفنون کی تعلیم دے۔[۵۲]

شبلی کی ذاتی کوششیں ندوہ کے علاوہ علوم شرقیہ کے دیگر اداروں میں بھی کام آئیں۔ مملکت حیدرآباد میں واقع 'دارالعلوم' کا نصاب بھی شبلی کا تجویز کردہ تھا[۵۳] اور انھوں نے حیدرآباد میں ایک آزاد اور مستقل یونی ورسٹی کا تمہیدی خیال بھی پیش کیا[۵۴] اور اس کے لیے ایک یادداشت تحریر کی۔[۵۵] اکابرِ حیدرآباد خصوصاً سید علی بلگرامی (۱۸۵۱ء – ۱۹۱۱ء) اور عمادالملک سید حسین بلگرامی (۱۸۴۴ء – ۱۹۲۶ء) سے ان کے روابط سید احمد خاں کے توسط سے پیدا ہوئے تھے۔ علی بلگرامی شبلی کے بڑے قدر دان تھے۔ شبلی نے قیام حیدرآباد میں ان کے کتب خانے سے خاصا استفادہ کیا، جس میں یورپی مطبوعات کا بڑا ذخیرہ تھا۔ کتب خانۂ اسکندریہ پر شبلی کے مقالے میں جن مستشرقین کے اقتباسات دیے گئے ہیں وہ علی بلگرامی کا ترجمہ تھے۔[۵۶] سید احمد خاں نے ان کا تعارف عمائدینِ حیدرآباد سے کرایا تھا اور ان کی تصانیف، مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم اور المامون مختلف وقتوں میں وہاں بھیجیں، جنھیں بہت پسند کیا گیا۔ الفاروق کی تصنیف کے ارادے کا بھی ان سے سید احمد خاں نے ذکر کیا۔[۵۷] شبلی نے حیدرآباد کا پہلا سفر ۱۸۸۱ء میں سید احمد خاں کی ہمراہی میں کیا تھا۔[۵۸] مولانا شبلی کا رابطہ حیدرآباد سے بعد میں اس طرح مزید قریب ہوا کہ جب وہ دوسری بار حیدرآباد گئے تو نظام محبوب علی خاں نے ان کو تصنیف وتالیف کی مد میں ایک مستقل وظیفہ جاری کردیا اور ان کی تمام آئندہ تصانیف کو سلسلۂ آصفیہ کے تحت شائع کرنا منظور کیا۔[۵۹] اس کے بعد ۱۹۰۱ء میں شبلی نے دوبارہ حیدرآباد کا سفر کیا اور وہاں قائم 'سررشتۂ علوم وفنون' کی نظامت پر فائز ہوئے اور چار سال تک یہ خدمت انجام دیتے رہے۔ اس عرصے میں انھوں نے الغزالی، علم الکلام، الکلام، اور سوانح مولانا روم تصنیف کیں۔ اس دوران ان کے روابط وہاں کے اصحابِ علم، دانشوروں اور عمائدین حکومت سے استوار رہے۔ ان ہی روابط کا ثمر تھا کہ حکومتِ حیدرآباد نے ندوہ کے لیے تین سو روپے ماہانہ امداد مقرر کردی جو ہمیشہ جاری رہی اور شبلی کے لیے ایک سو روپے ماہانہ وظیفہ مقرر ہوا جو وہاں باقاعدہ ملازمت پر فائز ہونے تک جاری رہا۔[۶۰]

اگر چہ شبلی ۱۹۰۴ء میں حیدرآباد سے رخصت ہوگئے لیکن ان کا رابطہ یہاں برقرار رہا۔ چنانچہ جب ۱۹۰۸ء میں وہاں واقع قدیم 'دارالعلوم' کا الحاق، جو پنجاب یونی ورسٹی سے تھا، ختم ہوگیا تو ایک نئے نصاب کی تشکیل ضروری سمجھی گئی۔ اس وقت مملکت حیدرآباد میں ناظم تعلیمات سید حسین بلگرامی تھے، جنھوں نے حکام بالا کی اجازت سے شبلی کو مدعو کیا کہ وہ اس مجلس کی رکنیت قبول کرلیں جو نصاب سازی کے لیے تشکیل پائی ہے۔ شبلی نے اس پیش کش کو قبول کرلیا اور حیدرآباد میں چند روز قیام کرکے ایک نصاب تیار کیا۔ وہ اپنے اس نصاب سے اس حد تک مطمئن ہوگئے تھے کہ انھوں نے اعلان تک کردیا کہ وہ دارالعلوم ندوہ کا الحاق اس دارالعلوم سے کردیں گے۔[۶۱] شبلی کا تجویز کردہ نصاب ضروری رسمی کارروائی کے بعد منظور کرلیا گیا۔ شبلی وہاں زیادہ نہ رکے۔ ان کی واپسی کے بعد ایک عرصہ اس نصاب کے نفاذ میں لگ گیا کہ شبلی حیات نہ رہے، مگر ان کے شاگرد اور عزیز مولانا حمیدالدین فراہی (۱۸۶۲ء-۱۹۳۰ء) دارالعلوم کے سربراہ مقرر ہوئے۔[۶۲] شبلی کے خیالات سے ان کے شاگردوں کا متاثر ہونا فطری تھا۔ فراہی نے نصاب میں ادبیات کا اضافہ کیا اور ذریعۂ تعلیم اردو قرار دے دیا۔[۶۳] وہ ۱۹۱۷ء تک دارالعلوم سے منسلک رہے۔ اردو کو ذریعۂ تعلیم قرار دینے کا ان کا اقدام بعد میں انقلاب آفریں ثابت ہوا اور جامعہ عثمانیہ کے قیام پر منتج ہو۔[۶۴]

حیدرآباد کے اداروں سے قطع نظر دیگر علاقوں تک بھی شبلی کی علمی شہرت عام تھی اور وہاں کے تعلیمی اداروں نے بھی ان سے فیض پایا۔ حکومت بنگال نے انھیں مشرقی بنگال و آسام کے عربی مدارس کی اصلاح کے لیے بنائی جانے والی مجلس کا رکن نامزد کیا تھا جو ۱۹۱۰ء میں بنی تھی۔[۶۵] وہ اس مجلس کے بھی رکن بنائے گئے تھے جسے مرکزی حکومت نے جولائی ۱۹۱۱ء میں علوم شرقیہ کی ترقی و اصلاح کے لیے تشکیل دیا تھا۔ اس مجلس کے اجلاس شملہ میں منعقد ہوئے۔ اس نے جو سفارشات مرتب کیں ان سے ملک کے ذہین طلبہ کو بے حد فائدہ پہنچا۔ سرکاری وظائف پر علوم شرقیہ کے ان طلبہ کو جو انگریزی جانتے تھے، یورپ کی اعلیٰ درسگاہوں میں اعلیٰ تعلیم کے لیے بھیجا جانا منظور ہوا۔ یہ بھی طے ہوا کہ واپسی پر انھیں سرکاری جامعات میں پروفیسری پر فائز کیا جائے گا۔ زبان و ادبیات کے ممتاز اسکالرز، مولوی محمد شفیع (۱۸۸۳ء- ۱۹۶۳ء)، (پنجاب یونی ورسٹی)، عبدالستار صدیقی (۱۸۸۵ء- ۱۹۷۲ء)، (الٰہ آباد

یونی ورسٹی)، عظیم الدین احمد(۱۸۸۰ء–۱۹۴۹ء)، (بہار یونی ورسٹی)، منصور علی(۱۸۸۸ء–۱۹۴۲ء)، (علی گڑھ یونی ورسٹی) یورپ گئے اور واپس آکر اپنی جامعات میں پروفیسر کے عہدوں پر فائز ہوئے۔ ہر ایک نے اپنی مثالی تحقیقات سے نام پیدا کیا۔ اس مجلس کی سفارشات کی روشنی میں 'ڈھاکا یونی ورسٹی' قائم کی گئی تو اس میں علوم شرقیہ کا نصاب بھی تجویز کیا گیا۔[۶۶] ۱۹۱۲ء میں صوبۂ متحدہ کی حکومت نے سرکاری اسکولوں میں مذہبی تعلیم کے اجرا کے لیے بنائی جانے والی مجلس میں شبلی کو بطور ایک رکن نامزد کیا۔[۶۷] شبلی کی مشاورت ناگ پور یونی ورسٹی میں مشرقی زبانوں کے شعبے کی نصاب سازی میں بھی شامل ہوئی جو بعد میں ۱۹۲۰ء میں قائم ہوئی۔[۶۸]

شبلی کی کوششیں مسلم یونی ورسٹی کے قیام میں بھی شامل رہیں، اگرچہ ابتداً وہ اس کی طرف سے پُرامید نہیں تھے، لیکن جب اس کے قیام کے آثار قوی ہوئے تو وہ اپنی اس خواہش کو نہ دبا سکے اور کہا کہ کاش 'وہ دن آئے جب علی گڑھ میں مسلمان فیلو نظر آئیں، مسلمان تعلیمی منصوبے بنائیں، مسلمان ہی نصاب بنائیں اور فیلوشپ کے فیصلے خود کریں۔[۶۹] جب اس تحریک میں زور وشور پیدا ہوا تو انھوں نے ندوہ کی جانب سے دس ہزار روپے کی خطیر رقم چندے میں اس وقت دی جب خود ندوہ اپنی امداد کے لیے کوشاں رہتا تھا۔[۷۰] مسلم یونی ورسٹی کے لیے چندہ جمع کرنے کے لیے جب ایک وفد آغا خاں (۱۸۷۷ء–۱۹۵۷ء) کی سربراہی میں لاہور گیا تو شبلی بھی اس وفد میں شریک تھے۔ اس یونی ورسٹی کے لیے قواعد وضوابط بنانے والی مجلس کے بھی وہ رکن تھے۔ اس طرح صاف لگتا ہے کہ جو مایوسی انھیں ابتدا میں اس یونی ورسٹی کے مقاصد اور اس کے قیام سے تھی وہ اب اس کی جانب سے پُرامید ہو گئے تھے۔ یوں اگرچہ شبلی کا نقطۂ نظر قومی صورتِ حال کے لحاظ سے تبدیلیوں کو ظاہر کرتا رہا ہے، اور مستقل مزاجی ان میں گاہے متاثر نظر آتی رہی ہے لیکن قدیم وجدید تعلیم کے معاملے میں وہ اپنے اخلاص سے دور کبھی نہ ہوئے اور مسلمانوں کی فلاح وبہبود، تعلیم کے وسیلے سے ہمیشہ ان کا مطمحِ نظر رہی۔

شبلی کے ایسے خیالات کو اور ان کی اس ضمن میں کوششوں کو ایک ایسا نمائندہ زاویۂ نظر سمجھا جاسکتا ہے جو ہمارے علما کے عمومی خیالات سے بہت مختلف اور متغائر نہیں اور جس پر مستقبل کا مسلم ہندوستان علومِ اسلامیہ کو رائج کرنے میں قریب قریب متفق ومعاون نظر آتا ہے۔ قدیم وجدید علوم کے

تعین یا ان کی آویزش میں یہ وہ مرحلہ تھا جس نے بڑی حد تک مستقبل کے لیے ایک لائحۂ عمل طے کر دیا تھا جس پر مستقبل کے علمی و تعلیمی تصورات استوار اور مروج ہوتے رہے۔

حواشی و حوالہ جات

* سابق ڈین، کلیۂ زبان و ادب، بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد۔

۱۔ سید معین الحق، معاشرتی و علمی تاریخ (کراچی، ۱۹۶۵ء)، ص ۴۶۳؛ نیز اس صورت حال کو سید سلیمان ندوی کی تصنیف حیات شبلی مطبوعہ اعظم گڑھ ۱۹۴۳ء کے مقدمے میں تفصیل سے دیکھا جاسکتا ہے ص ۱-۵۷۔

۲۔ اضلاع روہیل کھنڈ میں تقریباً پانچ ہزار علما مختلف مدارس میں درس و تدریس میں مصروف رہتے تھے۔ انھیں حافظ رحمت خاں کے خزانے سے تنخواہیں ادا کی جاتی تھیں۔ الطاف علی بریلوی، حیات حافظ رحمت خاں (کراچی، ۱۹۶۴ء)، ص ۳۳۔

۳۔ ولی اللہ فرخ آبادی، عہد بنگش کی علمی اور ثقافتی تاریخ (کراچی، ۱۹۶۳ء)، ص ۳۳۲۔

۴۔ ولیم آدم (William Adam) کے ابتدائی جائزے کے مطابق بنگال اور بہار میں ایک لاکھ مدرسے موجود تھے۔ دور دراز اور دشوار گذار مقامات پر دو ہزار کی آبادی پر ایک مدرسے کا تناسب تھا۔

پی ہارٹوگ (P. Hartog)، *Some Aspects of Indian Education Past and Present* (لندن، ۱۹۳۹ء)، ص ۱۳، ۷۵ و بعدہ۔

۵۔ جب کہ اس وقت قائم ہونے والے انگریزی اسکولوں میں صرف پڑھنا سکھایا جاتا تھا اور کبھی کبھی صرف ایک مضمون پڑھایا جاتا تھا۔

ایم اے لائرڈ (M. A. Laird)، *Missionaries and Education in Bengal* (آکسفرڈ، ۱۹۷۲ء)، ص ۴۳۔

۶۔ شیخ محمد اکرام، رود کوثر (لاہور، ۱۹۷۵ء)، ص ۶۰۵۔

۷۔ سید سلیمان ندوی، "مقدمہ" حیات شبلی (اعظم گڑھ، ۱۹۴۳ء)، ص ۲۱۔

۸۔ محمد عنایت اللہ، تذکرہ علماے فرنگی محل (لکھنؤ، ۱۹۳۰ء)، ص ۱۱۰؛ دلی کے علماے خیرآباد کے مدرسے کی بھی تقریباً یہی صورت تھی۔

۹۔ عبدالحئی لکھنوی، مجموعۃ فتاویٰ اردو ترجمہ (کانپور، ۱۳۷۳ھ)، ص ۹، ۱۷، ۲۱۸-۲۱۹، ۲۳۳، ۲۹۳۔

۱۰۔ مثلاً بیسویں صدی کے ربع اول میں مولانا عبدالباری فرنگی محلی کو سارے علماے ہند میں ایک امتیازی مقام حاصل رہا اور ہر طبقۂ فکر کے قومی و سیاسی رہنما ان کے حلقۂ ارادت میں شامل تھے۔ اس کا ایک تذکرہ فرانسس روبنسن (Francis Robinson)، *Separatism among Indian Muslims: The Politics of the United Provinces' Muslims 1860-1923* (کیمبرج، ۱۹۷۴ء)، ص ۲۶۶ میں ہے۔

۱۱۔ تفصیلات کے لیے: عبدالشاہد خاں شیروانی، "مقدمہ" باغی ہندوستان مصنفہ فضل حق خیرآبادی (بجنور، ۱۹۴۶ء)؛ عبدالسلام ندوی، حکمائے اسلام جلد دوم (اعظم گڑھ ۱۹۵۶ء)، ص ۳۳۹–۳۴۰۔

۱۲۔ تفصیلات کے لیے: محمد اقبال مجددی، "مقدمہ" مشمولہ مقاماتِ مظہری مصنفہ شاہ غلام علی مجددی (لاہور، ۱۹۸۲ء)؛ سید احمد خاں، تذکرہ دہلی مرتبہ اختر جوناگڑھی (کراچی، ۱۹۵۳ء)۔

۱۳۔ تفصیلات کے لیے: قیام الدین احمد *The Wahhabi Movement in India* (اسلام آباد، ۱۹۸۱ء)، ص ۲۱۵–۲۳۱؛ کے ایم اشرف، "Muslim Revivalists and the Revolt of 1857" مشمولہ پی سی جوشی، *Rebellion, 1857* (دہلی، ۱۹۵۷ء)۔

۱۴۔ عبیداللہ سندھی، شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک (لاہور، ۱۹۷۰ء)، ص ۱۵۰۔

۱۵۔ ایضاً، ص ۱۵۱؛ مدرسے کے اصول و قواعد کے لیے: محمد میاں، علمائے حق جلد اول (مرادآباد، ۱۹۳۹ء)، ص ۵۱–۵۹؛ مناظر احسن گیلانی کے ایک سوال کے جواب میں مولانا محمود الحسن نے کہا تھا کہ ۱۸۵۷ء کی جدوجہد میں ناکام ہونے کے بعد مولانا محمد قاسم نانوتوی نے اس مدرسے کو قائم کیا تو تعلیم سے زیادہ اس کی غرض کچھ اور تھی (یعنی مجاہد پیدا کرنا اور انگریزوں کے خلاف مجاہدانہ روح پھونکنا)، ص ۲۷۹ ج؛ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کی ناکامی کے بعد یہ ادارہ قائم کیا گیا کہ کوئی ایسا مرکز ہو جس کے زیر اثر لوگوں کو تیار کیا جائے تاکہ ۱۸۵۷ء کی ناکامی کی تلافی کی جائے۔ ایضاً، حصہ دوم، ص ۲۲۶؛

> مولانا قاسم نے دیوبند میں ایک مدرسہ گورنمنٹ کے مقابلے پر کھولا ہے، جس کا مقصد یہ ہے کہ سرحد کے لوگوں سے تعلقات پیدا کیے جائیں تاکہ گورنمنٹ سے جہاد آسان ہوجائے۔ یہ مدرسہ خفیہ طور پر طلبہ کو قواعد جنگ کی تعلیم دیتا ہے اور ہندوستان پر چڑھائی کے لیے کابل کو تیار کر رہا ہے۔

ضیاء الحسن فاروقی، *Deoband School and the Demand for Pakistan* (بمبئی، ۱۹۶۳ء)، ص ۲۳–۲۵۔

۱۶۔ عبیداللہ سندھی، ص ۱۴۹–۱۵۰؛ جی ایم ڈی صوفی، *Al-Minhaj: Being the Evolution of Curriculum in the Muslim Educational Institutions of India* (لاہور، ۱۹۴۱ء)، ص ۱۲۸–۱۳۲۔

۱۷۔ عبیداللہ سندھی، ص ۱۵۱؛ شیخ محمد اکرام، موجِ کوثر (لاہور، ۱۹۷۵ء)، ص ۲۰۷۔

۱۸۔ عبیداللہ سندھی، ص ۸۸؛ سید احمد خاں کی شاہ ولی اللہ کی فکر اور تحریک سے نسبت کے لیے: ابوسلمان شاہجہاں پوری، شاہ ولی اللہ اور سر سید، غیر مطبوعہ مقالہ برائے پی ایچ ڈی، شعبۂ اردو (سندھ یونی ورسٹی، ۱۹۸۱ء)؛ نیز باربرا ڈالی مٹکاف (Barbara Daly Metcalf)، *Islamic Revival in British India: Deoband, 1860-1900* (نیو جرسی، ۱۹۸۲ء)، ص ۴۲ و بعدہ؛ شیخ محمد اکرام، موجِ کوثر (لاہور، ۱۹۷۵ء)، ص ۱۹۳–۱۹۵۔

۱۹۔ یہاں تک کہ مولانا رشید احمد گنگوہی قرونِ وسطیٰ کے عقلی علوم کو بھی نصاب میں شامل کرنے کے حق میں نہیں تھے۔ رشید احمد گنگوہی، مکاتیبِ رشیدیہ جلد اول (دہلی، سن ندارد)، ص ۲۷؛ چنانچہ اپنے زمانے میں انھوں نے مدرسے کے نصاب سے معقولات کو خارج کر دیا تھا۔ مناظر احسن گیلانی، سوانح قاسمی حصہ اول (دیوبند، ۱۹۵۳ء)، ص ۲۹۲–۲۹۳۔

۲۰۔ ایضاً، ص ۲۷۹–۲۸۳۔

۲۱۔ ایضاً، ص ۲۸۶۔

۲۲۔ حسین احمد مدنی، نقش حیات جلد دوم (دیوبند ۱۹۵۳ء)، ص ۲۰۷۔

۲۳۔ ضیاء الحسن فاروقی، ص ۵۶-۵۸؛ ۱۹۱۷ء میں اپنے ایک بیان میں مولانا محمود حسن نے جمعیۃ الانصار کے قیام سے اپنی لاتعلقی ظاہر کی۔ بحوالہ فرانسس رونسن، ص ۲۶ ح۔

۲۴۔ دیوبند اور علی گڑھ کے درمیان کشیدگی کے لیے: ضیاء الحسن فاروقی، ص ۴۳-۴۵؛ حسین احمد مدنی، جلد اول، ص ۷۱۔

۲۵۔ عبیداللہ سندھی، ص ۱۵۶، ۱۵۹، ۱۶۳۔

۲۶۔ سید احمد خاں، مقالات سرسید مرتبہ محمد اسمٰعیل پانی پتی، جلد ہفتم (لاہور ۱۹۶۲ء)، ص ۲۰۸، ۲۷۹ وغیرہ۔ خاص مولانا قاسم کی شخصیت اور ان کے کاموں کی ستائش کے لیے: محبوب رضوی، تاریخ دیوبند (دیوبند ۱۹۵۲ء)، ص ۱۴۰، ۱۴۳؛ مولانا محمد قاسم نانوتوی "سید احمد خاں" مشمولہ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ (۲۴ اپریل ۱۸۸۰ء) ص ۴۶۷۔

۲۷۔ اکرام اللہ ندوی، وقار حیات (علی گڑھ ۱۹۲۵ء)، ص ۲۰۷۔

۲۸۔ حسین احمد مدنی، ص ۲۵۷؛ شیخ محمد اکرام، موج کوثر، ص ۲۰۳؛ مولانا محمود حسن نے 'جامعہ ملیہ اسلامیہ' کی تاسیس کے وقت ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۰ء کو علی گڑھ میں جو خطبہ پیش کیا تھا، اس کے یہ جملے نہایت اہم ہیں:

> اے نونہالان وطن، جب میں نے دیکھا کہ میرے اس درد کے غم خوار جس میں میری ہڈیاں پگھلی جارہی ہیں، مدرسوں اور خانقاہوں میں کم اور اسکولوں اور کالجوں میں زیادہ ہیں، تو میں نے اور میرے چند مخلص احباب نے ایک قدم علی گڑھ کی طرف بڑھایا اور اس طرح ہم نے ہندوستان کے تاریخی مقاموں دیوبند اور علی گڑھ کا رشتہ جوڑا۔ بحوالہ ایضاً۔

۲۹۔ سید احمد خاں، تہذیب الاخلاق شمارہ ۱۳-۱۵ (۱۸۷۳ء-۱۸۷۴ء)؛ ص ۱۷۰۔

۳۰۔ سید احمد خاں، مکمل مجموعۂ لکچرز و اسپیچز مرتبہ محمد فضل الدین (لاہور ۱۹۰۰ء)، ص ۱۵۹۔

۳۱۔ الطاف حسین حالی، حیات جاوید حصہ دوم (دہلی ۱۹۳۹ء)، ص ۱۹۵۔

۳۲۔ ایضاً۔ یہی صورت بعد میں پنجاب یونی ورسٹی میں بھی پیش آئی۔ وہاں بی اے اور ایم اے کے ساتھ ساتھ 'بالغ العلوم' اور 'مالک العلوم' کے نصاب بھی شروع کیے گئے، لیکن ان نصابوں کا بھی وہی حشر ہوا جو علی گڑھ کالج میں مشرقی علوم کے شعبے کا ہوا تھا۔ بحوالہ نور الحسن نقوی، سرسید اور ہندوستانی مسلمان (علی گڑھ ۱۹۷۳ء)، ص ۱۱۶۔

۳۳۔ اس کانفرنس نے بعد میں اپنا نام 'مسلم ایجوکیشنل کانفرنس' رکھ لیا۔ اس کے مقاصد اور سرگرمیوں کے لیے الطاف حسین حالی، حیات جاوید حصہ اول (دہلی ۱۹۳۹ء)، ص ۲۲۶-۲۲۷ و بعدہ؛ تفصیلات کے لیے: اختر الواسع، *Education of Indian Muslims, A Study of the All India Muslim Educational Conference* (علی گڑھ ۱۹۷۷ء)؛ حبیب الرحمن خاں شیروانی، پنجاہ سالہ تاریخ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس (بدایوں، ۱۹۳۷ء)۔

۳۴۔ حبیب الرحمن خاں شیروانی، ص ۴-۵۔

۳۵۔ 'ندوۃ العلماء' کے سالانہ جلسے منعقدہ ۱۸۹۴ء میں شبلی کی تقریر بعنوان "علما کے فرائض" اس موضوع پر مفصل اور نمائندہ ہے۔ مشمولہ خطبات شبلی، ص ۲۸-۳۶۔

۳۶۔ مقالات شبلی جلد سوم، ص ۱۲۳-۱۲۴، ۱۳۷-۱۳۹۔

۳۷۔ عبد الرزاق کانپوری، یاد ایام (حیدر آباد دکن، ۱۹۳۶ء)، ص۱۰۴؛ سید سلیمان ندوی، ص۳۰۳–۳۱۰۔

۳۸۔ یہاں اس امر کو بھی پیش نظر رکھا جاسکتا ہے کہ ۱۸۹۲ء میں کونسلوں کا قانون نافذ ہوا تھا، علما نے یہ سوچا کہ منتخب حکومت کا قیام معاشرے میں اس کے اثرات کے لیے مزید رکاوٹیں پیدا کرے گا۔ ندوۃ العلماء کے قیام سے انھیں امید بندھی تھی کہ یہ ادارہ علما کی حکومت کے قیام میں معاون ثابت ہوگا۔ ایضاً، ص۲۸۰؛ اکرام، موج کوثر، ص۱۲۹۔

۳۹۔ الطاف حسین حالی، حصہ اول، ص۲۶۳ ح۔

۴۰۔ جے این فارقوہر (J. N. Farquhar)، *Modern Religious Movement in India* (نیویارک، ۱۹۱۵ء)، ص۳۵۰۔

۴۱۔ تفصیلات کے لیے، جی ایم ڈی صوفی، ص۱۴۰–۱۴۱۔

۴۲۔ محمد مجیب، *Indian Muslims* (کیمبرج، ۱۹۶۶ء)، ص۴۰۹۔

۴۳۔ باربرا ڈالی مٹکاف، ص۳۳۶۔

۴۴۔ سید محمد الحسنی، سیرت مولانا سید محمد علی مونگیری، بانی ندوۃ العلماء (لکھنؤ، ۱۹۶۴ء)، ص۱۵۷؛ یاد رکھیے کہ ترکی اور فارسی بھی کافروں کی زبانیں تھیں، انگریزی بھی اسلامی زبان بن سکتی ہے۔ بحوالہ باربرا ڈالی مٹکاف، ص۳۳۹۔

۴۵۔ سید سلیمان ندوی، ص۴۲۱؛ سید محمد الحسنی، ص۶۷–۶۹۔

۴۶۔ سید احمد خاں، "مکتوب بنام مولانا محمد علی کانپوری" مشمولہ مکتوبات سر سید مرتبہ اسماعیل پانی پتی (لاہور، ۱۹۵۹ء)، ص۴۵؛ نواب محسن الملک نے ندوہ کے مقاصد کی حمایت کی اور اس کی مماثلت میں علی گڑھ کا نقطۂ نظر پیش کیا۔ اس کی حمایت میں ان کی قرارداد اور تقریر، مشمولہ محسن الملک ص۲۴۱؛ نواب وقار الملک کے لیے، اکرام اللہ ندوی، ص۴۰۸؛ و نیز سید محمود کے لیے، ابوالحسن ندوی، ص۱۳۸۔

۴۷۔ تفصیلات کے لیے مقالات شبلی جلد ہشتم ص۷–۱۲۔

۴۸۔ اکرام، رود کوثر، ص۳۴۹۔

۴۹۔ ایضاً، موج کوثر، ص۱۹۱؛ و نیز عزیز احمد، ص۵۹۔

۵۰۔ سلیمان ندوی، "مقدمہ"، ص۳۔

۵۱۔ ایضاً، ص۲۰–۲۱۔

۵۲۔ سلیمان ندوی، ص۳۱۴۔

۵۳۔ ایضاً، ص۵۰۷ و بعدہ۔

۵۴۔ 'دار العلوم' کے نصاب کی اصلاح دراصل 'جامعہ عثمانیہ' کے قیام کا پہلا مرحلہ تھا، ایضاً، ص۵۱۱۔

۵۵۔ مقالات شبلی جلد سوم، ص۱۵۲؛ تفصیلات کے لیے: سلیمان ندوی، ص۵۱۳–۵۱۵۔

۵۶۔ سلیمان ندوی، ص۱۴۰۔

۵۷۔ ایضاً، ص۱۶۷۔

۵۸۔ ایک دوسری شہادت سلیمان ندوی نے شبلی کے ایک فارسی قصیدے سے پیش کی ہے کہ شبلی سید احمد خاں کے ہمراہ نہیں بلکہ

الگ اپنے وطن سے کانپور، لکھنؤ اور بھوپال ہوتے ہوئے حیدرآباد گئے تھے۔ ص ۱۴۷؛ ونیز کلیات شبلی (فارسی)، ص ۸–۱۰۔

۵۹۔ سلیمان ندوی، ص ۲۳۱۔

۶۰۔ سید مظہر علی، ص ۱۹، ۹۰۔

۶۱۔ سروری، ص ۵۸؛ ونیز ہاشمی، ص ۳۱– ۳۲؛ اس ضمن میں انھوں نے جو یادداشت تحریر کی تھی وہ مقالات شبلی جلد سوم میں شامل ہے؛ ص ۱۴۷–۱۵۸، ونیز سلیمان ندوی، ص ۳۹۷–۴۰۱۔

۶۲۔ ہاشمی، ص ۳۷؛ شبلی کے خیالات سے ان کے شاگردوں کا متاثر ہونا فطری تھا۔ فراہی نے نصاب میں ادبیات کا اضافہ کیا اور ذریعہ تعلیم اردو قرار دے دیا۔ سلیمان ندوی، ص ۴۰۳۔

۶۳۔ ایضاً، ص ۴۰۲–۴۰۳۔

۶۴۔ جس کے بارے میں شبلی کے عزیز شاگرد سید سلیمان ندوی کا خیال ہے کہ: (جامعہ عثمانیہ) نے وجود میں آ کر ہندوستان کی تعلیمی دنیا میں ایک انقلاب برپا کر دیا اور اس کے دینیات اور علوم مشرقیہ کا صیغہ ابتدائی تعلیم، طرز تعلیم، اساتذہ اور انگریزی و علوم جدید کی آمیزش سے مولانا شبلی کے مرتبہ نقشے کا اچھا خاصہ خاکہ ہے۔ ایضاً، ص ۴۰۲۔

۶۵۔ ایضاً، ص ۵۱۶۔

۶۶۔ ایضاً، ص ۵۲۱۔

۶۷۔ ایضاً، ص ۵۲۳۔

۶۸۔ ایضاً، ص ۴۱۷–۴۱۹۔

۶۹۔ ایضاً، ص ۴۱۴۔

۷۰۔ ایضاً، ص ۴۱۵۔

مآخذ

احمد، عزیز۔ *An Intellectual History of Islam in India*۔ ایڈنبرا، ۱۹۶۹ء۔

احمد، قیام الدین۔ *The Wahhabi Movement in India*۔ اسلام آباد، ۱۹۸۱ء۔

اختر الواسع۔ *Education of Indian Muslims, A Study of the All India Muslim Educational Conference*۔ علی گڑھ، ۱۹۷۷ء۔

اشرف، کے ایم۔ "Muslim Revivalists and the Revolt of 1857"۔ مشمولہ جوشی، پی سی۔ *Rebellion, 1857*۔ دہلی، ۱۹۵۷ء۔

اکرام، شیخ محمد۔ رود کوثر۔ لاہور، ۱۹۷۵ء۔

______۔ موج کوثر۔ لاہور، ۱۹۷۵ء۔

بریلوی، الطاف علی۔ حیات حافظ رحمت خاں۔ کراچی، ۱۹۶۴ء۔

حالی، الطاف حسین۔ حیات جاوید۔ دہلی، ۱۹۳۹ء۔

خاں، سید احمد۔ تذکرہ دہلی۔ مرتبہ اختر جونا گڑھی۔ کراچی، ۱۹۵۳ء۔

______۔ تہذیب الاخلاق علی گڑھ۔ جلد پنجم، شمارہ ۱۳–۱۵ (۱۸۷۳ء–۱۸۷۴ء) ص ۱۷۰۔

______۔ مقالات سرسید۔ مرتبہ محمد اسمٰعیل پانی پتی۔ جلد ہفتم۔ لاہور، ۱۹۶۲ء۔

______۔ "مکتوب بنام مولانا محمد علی کانپوری"۔ مشمولہ مکتوبات سرسید۔ مرتبہ اسماعیل پانی پتی۔ لاہور، ۱۹۵۹ء، ص ۴۵۔

______۔ مکمل مجموعۂ لکچرز و اسپیچز۔ مرتبہ محمد فضل الدین۔ لاہور، ۱۹۰۰ء۔

خاں، مہدی علی، محسن الملک۔ مجموعۂ لیکچرز و اسپیچز۔ لاہور، ۱۹۰۵ء۔

رضوی، محبوب۔ تاریخ دیوبند۔ دیوبند، ۱۹۵۴ء۔

رونسن، فرانسس (Robinson, Francis)۔ *Separatism among Indian Muslims: The Politics of the United Provinces' Muslims 1860–1923*۔ کیمرج، ۱۹۷۴ء۔

سروری، عبدالقادر۔ حیدر آباد دکن کی تعلیمی ترقی، گذشتہ ربع صدی میں۔ حیدرآباد: اعظم اسٹیم پریس، ۱۹۳۴ء۔

سندھی، عبیداللہ۔ شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک۔ لاہور، ۱۹۷۰ء۔

شاہجہاں پوری، ابوسلمان۔ شاہ ولی اللہ اور سرسید۔ غیر مطبوعہ مقالہ برائے پی ایچ ڈی، شعبۂ اردو، سندھ یونی ورسٹی، ۱۹۸۱ء۔

شیروانی، حبیب الرحمن خاں۔ پنجاہ سالہ تاریخ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس۔ بدایوں، ۱۹۳۷ء۔

شیروانی، عبدالشاہد خاں۔ "مقدمہ"۔ باغی ہندوستان۔ مصنفہ فضل حق خیرآبادی۔ بجنور، ۱۹۴۶ء۔

صوفی، جی ایم ڈی۔ *Al-Minhaj: Being the Evolution of Curriculum in the Muslim Educational Institution of India*۔ لاہور، ۱۹۴۱ء۔

عنایت اللہ، محمد۔ تذکرہ علمائے فرنگی محل۔ لکھنؤ، ۱۹۳۰ء۔

فارقوہر، جے این (Farquhar, J. N.)۔ *Modern Religious Movement in India*۔ نیویارک، ۱۹۱۵ء۔

فاروقی، ضیاء الحسن۔ *Deoband School and the Demand for Pakistan*۔ بمبئی، ۱۹۶۳ء۔

فرخ آبادی، ولی اللہ۔ عہد بنگش کی علمی اور ثقافتی تاریخ۔ کراچی، ۱۹۶۳ء۔

کانپوری، عبدالرزاق۔ یاد ایام۔ حیدرآباد دکن، ۱۹۴۶ء۔

گنگوہی، رشید احمد۔ مکاتیب رشیدی۔ جلد اول۔ دہلی، سنہ ندارد۔

گیلانی، مناظر احسن۔ سوانح قاسمی۔ حصہ اول و دوم۔ دیوبند، ۱۹۵۳ء۔

لائرڈ، ایم اے (Laird, M. A.)۔ *Missionaries and Education in Bengal*۔ اوکسفرڈ، ۱۹۷۲ء۔

لکھنوی، عبدالحی۔ مجموعۂ فتاویٰ اردو ترجمہ۔ کانپور، ۱۳۷۳ھ۔

علی، سید مظفر۔ حیدر آباد کی علمی فیاضیاں۔ حیدرآباد، ۱۳۵۵ھ۔

مٹکاف، باربرا ڈالی (Metcalf, Barbara Daly)۔ *Islamic Revival in British India: Deoband, 1860–1900*۔ نیوجرسی، ۱۹۸۲ء۔

محمد الحسنی، سید۔ سیرت مولانا سید محمد علی مونگیری، بانی ندوۃ العلماء۔ لکھنؤ، ۱۹۶۴ء۔

مجددی، محمد اقبال۔ "مقدمہ"۔ مشمولہ مقامات مظہری۔ مصنفہ شاہ غلام علی مجددی۔ لاہور، ۱۹۸۲ء۔

مجیب، محمد۔ *Indian Muslims*۔ کیمبرج، ۱۹۶۶ء۔

مدنی، حسین احمد۔ نقش حیات۔ جلد دوم۔ دیوبند، ۱۹۵۳ء۔

معین الحق، سید۔ معاشرتی و علمی تاریخ۔ کراچی، ۱۹۶۵ء۔

میاں، محمد۔ علمائے حق۔ جلد اول۔ مراد آباد، ۱۹۳۹ء۔

نانوتوی، مولانا محمد قاسم۔ "سید احمد خاں"۔ مشمولہ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ (۲۴ اپریل ۱۸۸۰ء)۔

ندوی، ابوالحسن علی۔ ہندوستانی مسلمان۔ لکھنؤ، ۱۹۶۱ء۔

ندوی، اکرام اللہ۔ وقار حیات۔ علی گڑھ، ۱۹۲۵ء۔

ندوی، سید سلیمان۔ حیات شبلی۔ مطبوعہ اعظم گڑھ، ۱۹۴۳ء۔

ندوی، عبدالسلام۔ حکمائے اسلام۔ جلد دوم۔ اعظم گڑھ، ۱۹۵۶ء۔

نعمانی، شبلی۔ خطبات شبلی۔ اعظم گڑھ، ۱۹۴۱ء۔

______۔ کلیات شبلی (فارسی)۔ بہ اہتمام مولانا مسعود علی ندوی۔ اعظم گڑھ، سن ندارد۔

______۔ مقالات شبلی۔ جلد سوم۔ اعظم گڑھ ۱۹۳۵ء۔

______۔ مقالات شبلی۔ جلد ہشتم۔ اعظم گڑھ ۱۹۳۸ء۔

نقوی، نورالحسن۔ سرسید اور ہندوستانی مسلمان۔ علی گڑھ، ۱۹۷۳ء۔

ہارٹوگ، پی (Hartog, P.)۔ *Some Aspects of Indian Education, Past and Present*۔ لندن، ۱۹۳۹ء۔

ہاشمی، نصیرالدین۔ تذکرہ دارالعلوم۔ حیدرآباد دکن، ۱۳۶۲ھ۔